سائنس

مذہبی عقائد اور سائنس

ڈاکٹر عبد الحمید شیخ

مذہب نہ طبیعات ہے نہ کیمیا کہ حقائقِ فطرت کی ترجمانی علّت و معلول کے رنگ میں کرے۔ اس کا مقصد ہے محسوسات و مدرکات کی الگ تھلگ نوع یعنی مذہبی مشاہدات کی تعبیر جس کے مدلولات کو سائنس کے مدلولات میں مدغم کرنا ممکن نہیں۔ مذہب نے تو سائنس سے بھی بہت پہلے اس بات پر زور دیا کہ ہم اپنی مذہبی زندگی میں ٹھوس حقائق سے مَس پیدا کریں۔ ان میں کوئی نزاع ہے تو یہ نہیں کہ ایک کی بنا محسوسات کے مشاہدے پر ہے اور دُوسرا ان سے بے تعلق۔ دونوں کی ابتدا محسوسات سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ان میں جو نزاع ہے اس غلط فہمی کے باعث کہ دونوں کے پیشِ نظر ایک ہی قسم کے حقائق کی تعبیر ہے۔ حالانکہ مذہب کے سامنے محسوسات و مدرکات کی ایک مخصوص نوع ہے اور اس کا مقصد یہ کہ ان کی کنہ تک پہنچے۔

علامہ اقبال

تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

مذہبی عقاید اور جدید سائنس

آج کے خلائی دور کے انسان کو بطورِ خاص یہ مطلوب ہے کہ اس کا سائنسی علم ممکنہ حد تک اس کے مذہبی عقاید کی صداقت کی گواہی دے۔ اگرچہ عقاید پر غیر مشروط یقین ہی ایمان کا لازمی جزو ہے، لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی وہ بات اور اس کا جواب قابلِ غور ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کی تھی یعنی:

ترجمہ:

"اے میرے پروردگار: مجھے دکھا دیجیے کہ آپ مُردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے۔ ارشاد فرمایا: کیا تم یقین نہیں لاتے؟ انھوں نے عرض کیا: یقین کیوں نہ لاتا لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے۔"[1]

جہاں تک ایک عام انسان کا تعلق ہے وہ خدا سے براہِ راست مخاطب نہیں ہوتا۔ ایسے شخص کو طمانیتِ قلب حاصل کرنے کے لیے اپنے علم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ مذہبی عقاید اس کے علم کی کسوٹی پر پورے نہ اتریں۔ اس کا ایک مطلب جہاں یہ ہوگا کہ عقاید باطل ہیں، وہاں بجا طور پر ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا علم ابھی اس سطح تک نہیں پہنچا کہ ایسے مذہبی عقاید کو عقلی طور پر بیان کر سکے۔ اگر ایسا ممکن ہو بھی جائے تو بھی عقاید کے ثبوت میں علمی یا سائنسی دلائل کسی سند کی حیثیت نہیں رکھتے اور وہ اس لیے کہ الہامی عقاید خدائی محکم ہیں اور اطمینانِ قلب کی خاطر ان کی علمی یا سائنسی توجیہ ایک انسانی کاوش ہے جو اپنی کمتر حیثیت کے لحاظ سے کسی اصلی ہستی کے اقوال و افعال کو سند عطا کرنے کی مجاز نہیں لیکن اس سبب کے باوصف عملی طور پر یہ ہوتا ہے کہ اگر سائنسی

تجربات عقاید کی صداقت کو ثابت کر دیں تو عقیدہ پہ ایمان مضبوط تر ہو جاتا ہے اور اس کے برخلاف اگر معلوم سائنس عقاید کی صداقت کو ثابت کرنے میں ناکام رہے یا پھر برعکس نتائج پہ منتج ہو تو عقیدہ پہ ایمان متزلزل بھی ہو سکتا ہے۔ یہ امکان اس معاشرے میں کم ہوگا کہ جہاں مذہب کی گرفت انسان پہ مضبوط ہو۔ یہاں پہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کچھ عقاید کا مذہب سے اصلاً کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر نیم مذہبی راہنما انہیں از خود وضع کر کے داخلِ مذہب کر دیتے ہیں۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے دوران یورپ کے اہلِ کلیسا نے زمین کو کل کائنات کا مرکز ٹھہرایا اور اسے جزوِ ایمان قرار دیا۔ سائنس دانوں نے جب اپنے مشاہدات اور تجربات کی بنا پہ اس عقیدہ کی نفی کی تو اس کے نتیجہ میں عیسائیت کو جو دھچکا لگا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ایسے ہی کچھ عقاید مسلمانوں کے اذہان میں بھی ڈال دیے گئے تھے جن میں چودھویں صدی ہجری کا آخری صدی ہونا مثال کے طور پہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ الغرض طمانیتِ قلب کے حصول کی خاطر مختلف مذاہب کے بعض عقیدے جہاں مذہبی راہنماؤں اور روحانی عاملوں کی توجہ کا مرکز بنے وہاں وہی عقیدے سائنس دانوں اور فلسفیوں کی توجہ کا باعث بھی بنے۔ مؤخر الذکر ہر دو قسم کے دانشوروں نے اپنے اپنے انداز سے مذہبی عقاید پر بحث کی اور نتائج اخذ کیے۔ موجودہ دور میں ایسی ہی کوششیں مادہ اور توانائی کے حوالے سے ہیں اور مضمون ہٰذا میں زیادہ تر اسی سمت میں ایک کوشش ہے۔

ہر مذہب کی بنیاد کچھ عقاید پر ہوتی ہے اور ان عقاید کو بلاچون وچرا تسلیم کرنا اس مذہب کے پیروکار کے لیے شرطِ اوّل ہے۔ جب سائنس کچھ مظاہرِ قدرت بیان کرنے کے قابل ہوئی تو یہ گمان بھی ہونے لگا کہ اس کے توسط سے مذہبی عقاید کی تصدیق بھی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ یہ جاننے کے لیے کہ موت کے بعد انسان پہ کیا گزرتی ہے، اس تجسس میں منظم اور غیر منظم تجربات ہوئے اور نہ جانے کتنے لوگوں نے اپنی زندگیاں گنوا دیں۔ اسی طرح کائنات کے وجود میں آنے کی عقلی اور سائنسی توجیہ تلاش کرنے میں آج کے خلائی دور کا انسان جس قدر سرگرداں ہے اس سے قبل نہ تھا۔

مسلمانوں کے عقاید کتاب اللہ سے ماخوذ ہیں۔ ان میں خدا کا واحد اور خالقِ کائنات ہونا، ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہنا، اس کے فرشتوں، پیغمبروں اور پیغمبروں پہ نازل کتب پہ ایمان لانا، اس کا عام انسانوں اور دیگر جانداروں کو پیدا کرنا اور انہیں فرداً فرداً اور پھر ایک دن اجتماعاً مارنا، مُردوں کو دوبارہ زندگی دے کر ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا دینا شامل ہیں۔ عقاید میں خدائی معجزات پہ یقین بھی شامل ہے اور ان معجزات میں سب سے بڑا معجزہ خود قرآن کریم ہی ہے کہ جس کے ایک ایک لفظ کی صداقت پر ایمان لانا مسلمانوں کے لیے لازم ہے۔

ہمارا مضمون قرآن کریم میں مذکور ان ہی امور سے متعلق ہے کہ جن کی صداقت پر ایمان لایا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ کا ذکر کر دیا گیا ہے اور بقیہ میں سے کچھ کا ذکر حسب ضرورت آگے آتا رہے گا۔ عقاید پہ ایمان لا چکنے کے بعد جب اطمینانِ قلب کے حصول کی خاطر ان کی نوعیت سمجھنے کی طرف دھیان راغب ہوا تو اُن جیسے جاننے کی کوشش ہوئی کہ وہ کیا ہے، وہ خود خدا کی ذات اور انسان کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت تھی۔ ان ہی کوششوں نے روحانیت اور تصوف جیسے علوم کو جنم دیا کہ جس کی بنا پہ ہمہ اوست اور ہمہ از اوست جیسے فلسفوں کے علاوہ اور بھی بہت سے نازک مسائل زیرِ بحث آ گئے۔ جب تجرباتی اور مشاہداتی دور کا آغاز ہوا اور معروف علمِ سائنس کے تحت ڈارون کا نظریہ ارتقاء سامنے آیا تو یہ مذہبی نظریات سے متصادم تھا۔ اسی طرح جب نظریۂ اضافیت جیسی چیز دریافت ہوئی تو اس کے نتائج کی روشنی میں زمان و مکان کے دیرینہ تصورات متاثر ہوئے حتیٰ کہ وقت کے حوالے سے معراج النبیؐ کی نوعیت زیرِ بحث آ گئی۔

عقیدے صرف مسلمانوں میں ہی نہیں ہیں بلکہ یہودیوں اور نصرانیوں کے ہاں بھی ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے حوالوں سے بہت سے معجزات ہیں۔ معجزے خدا کی طرف سے اس کے پیغمبروں کو عطا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی انسان اپنی سطح پر عقل کو عاجز کر دینے والی کوئی ایسی چیز پیش کر دے تو اسے شعبدہ بازی یا جادوگری کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کا محیرّ العقول عمل اس لیے ناقص تصوّر ہوگا کہ اس میں عامل کی کوئی ذاتی غرض شامل ہوگی۔ شعبدہ گری کے تحت کوئی عامل حاضر اجسام کو نہ صرف غائب کر دیتا ہے اور غائب اجسام کو حاضر بلکہ اجسام کی ہیئت میں تبدیلی بھی لا سکتا ہے کہ جس کے تحت بے جان اجسام جاندار نظر آتے ہیں۔ فرعون کے جادوگروں کا رسیوں کو سانپ بنا دینے کو اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور یہ واقعہ قرآن کریم میں پوری طرح مذکور ہے۔ اعلیٰ اور ارفع سطح پر ایسا ہی مظاہرہ قدرت کی طرف سے جوابا ہوا یعنی سانپوں کو نگلنے کے لیے جب حکمِ ربّ کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ اژدھا بن گیا۔ خدا کے حکم کی فوری تعمیل پر وجود میں آنے والا اژدھا خود صاحبِ معجزہ یعنی حضرت موسیٰؑ کے لیے بھی وقتی حیرت و استعجاب کا باعث بنا۔ اگرچہ رسیوں کا سانپ اور عصا کا اژدھا بن جانا دونوں عوامل ایک ہی نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں لیکن اژدھا کا سانپوں کو نگل جانا اژدھا کے حقیقی وجود کو ظاہر کرتا ہے اور رسیوں کا سانپ بن جانا جادوگروں کے فریبِ نظر کی نشاندہی کرتا ہے اور وہ اس لیے کہ کسی چیز کی اصل ہیئت کو بدلنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ جب کوئی عامل اپنے مخاطب کے ذہن پر حاوی ہو جائے تو وہ اپنی مخصوص ذہنی برتری کے تحت دوسروں کے اذہان کو مسخر کر کے انہیں عارضی طور پر وہی کچھ دکھا سکتا ہے جو اس کا مقصود ہوگا۔ یہ سب کچھ اگر ہوش کی حالت میں رونما ہو تو نظر بندی ہے اور اگر نیند یا مصنوعی خواب کی حالت میں ہو تو جدید سائنسی اصطلاح میں وہ

کہلائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتوں کی پہچان کے لیے انسان کی رسائی کو محدود نہیں کیا۔ ہاں اگر قدغن لگائی ہے تو ان عملیات پر کہ جن کے ذریعے دوسروں کو جسمانی، مالی یا پھر اخلاقی نقصان پہنچنے کا امکان ہو۔ جہاں جائز مذہبی اعتقادات کے مجروح ہونے کا احتمال ہو وہاں بھی ایسے عوامل ناپسندیدہ اور گناہ ٹھہرے ہیں۔ معجزات ہوں یا شعبدہ جات، دونوں مخصوص کیفیت اور صنعت کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ معجزات کے حصول میں پیغمبروں کی اپنی کاوش کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ انہیں حسبِ ضرورت خدا کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جب اللہ کے نیک بندے اپنی ریاضتوں سے کچھ حیران کن کام سرانجام دیں تو انہیں کرشمے یا کرامات کہا جاتا ہے اور ان کے علم کو علوی تصور کرتے ہیں۔ اگر کوئی بدطینت شخص کوئی ایسی ہی خرقِ عادت چیز اپنی خصلت اور دنیاوی غرض کی تسکین کے لیے سرانجام دے تو اس کے علم کو سفلی کہا گیا ہے۔ علم اگرچہ ایک ہی ہے لیکن اس کی اخلاقی حیثیت کے پیشِ نظر اسے دو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر مؤخرالذکر کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے کہ سفلی علم کی وجہ سے مذہب میں ایسے عقاید نہ در کر آئیں کہ جو لوگوں کے ایمان کو کمزور کر دیں۔

اگر ہم نفسِ مضمون کی طرف واپس لوٹیں کہ خدا ایک ہے تو اسے سمجھنے کے لیے یہ مثال قابلِ غور ہوگی یعنی جس طرح جنم دینے والی ہر ماں کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں بچہ اس کا ہے لیکن بچے کو کسی طور باور کرانا پڑتا ہے کہ فلاں عورت اس کی ماں ہے، اسی طرح خلاقِ عالم کو تو معلوم ہے کہ یہ ساری کائنات اور اس میں بسنے والے انسان وغیرہ اس کی تخلیق ہیں لیکن اس امر سے نابلد مخلوق کو یہی باور کرانے کے لیے اس نے ہر قوم کے پاس وقتاً فوقتاً اپنے رسول بھیجے۔ چونکہ بے بصیرت لوگوں کے لیے اَن دیکھے خدا کے وجود کو تسلیم کرنا ذرا مشکل کام تھا، اس لیے انہوں نے جن بھی محرکات کے تحت خدا کے وجود کی ضرورت محسوس کی ان کے تابع ہو کر اپنے دیوتا خود تخلیق کیے اور پھر اپنے ہی تراشے ہوئے بتوں کے غلام بنے۔ عہدِ قدیم کے اس انسان نے اپنے معبود دیوتاؤں سے کم و بیش وہی اوصاف منسوب کیے کہ جن سے وہ خود متصف تھا۔ فرق اگر رکھا تو اس قدر کہ اس نے اپنے دیوتاؤں کو بہت زائد اوصاف سے نوازا تاکہ وہ اس سے برتر نظر آئیں اور اس طرح لائقِ خوف و عبادت ہوں۔ نیز اپنے میں سے نیک بندوں کو دیوتاؤں کا اوتار کہا اور یہ بھی تصور کیا کہ وہ انسانی روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور مخصوص کام سرانجام دیتے ہیں اور پھر اپنے اصل روپ میں اور مقام پہ لوٹ جاتے ہیں۔ کچھ دیوتاؤں کو کائنات کی تخلیق، اسے قائم رکھنے اور بالآخر فنا کر دینے کی صنعت بھی دی گئی۔ کچھ کو شادی شدہ کہا گیا اور ان کی اولادوں سے بھی حسبِ ضرورت اوصاف منسوب کیے گئے۔ کچھ دیوتاؤں کو عورت اور مرد یا پھر انسان اور حیوان یا پرندوں کا مرکب بنایا ایسے دیوتا باہمی اتحادِ ذات و صفات کی علامت ٹھہرے۔ دیوتاؤں کے مسکن پہاڑوں کی چوٹیاں، غار یا پھر چاند،

سورج اور ستاروں پر مشتمل ہونے تاکہ انسانی پہنچ سے باہر رہیں۔ دیوتاؤں کو غیر مرئی کہا گیا لیکن ان کے بُت بھی بنا دیے گئے تاکہ انہیں سامنے رکھ کر ان کی عبادت کرنے میں آسانی ہو۔ یہ دیوتا آہستہ آہستہ بہت سے قدیم مذاہب کی بنیاد بنے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب دیوتاؤں کی تصویریں بنائی گئیں تو ان کی شکل وصورت انسان ہی کی شکل وصورت پر منتج ہوئی، البتہ ان کے سر اور دیگر اعضاء کی تعداد اور سائز بڑا بنایا گیا تاکہ ان کا زیادہ قوی ہونا، سوچنے کی زیادہ اہلیت رکھنا، ہمہ گیر ہونا، چہار سمت میں دیکھ سکنا، ایک مقام سے دوسرے مقام تک فوراً پہنچ جانا وغیرہ وغیرہ بھرپور طریقے سے واضح ہو سکیں۔ انسان نے اپنے ہی تخلیق کردہ دیوتاؤں کے شب و روز کی طوالت بھی انہیں کے حساب سے ہزاروں سال کے برابر متعین کی۔ اس کے بعد دیوتاؤں کے وجود کو کچھ ایسے یقین کے ساتھ تسلیم کیا کہ انہیں ہر طرح سے خوش رکھنا اوّل مقصد قرار پایا۔ حتیٰ کہ اس غرض کے پیش نظر جان و مال کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔

ہندوؤں کے ماسوا اگرچہ عرصۂ دراز سے دیوتاؤں کی پرستش ختم ہو چکی ہے اور الہامی مذاہب کی آمد کے بعد ان کے وجود کو محض افسانوی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود اپنی ہزار ہا سالہ پرانی بُت پرست ذہنیت کے زیرِ اثر اہلِ یورپ کے مصوّروں نے جب بھی الہامی خدا کو پیش کیا تو اس کی تصویر بھی دورِ قدیم کے دیوتاؤں کے مشابہ بنائی۔

اس سارے مبحث کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے جب بھی خدا کو تصوّر کیا تو اس کی شکل کا تعین اپنی ذات وصفات اور اپنے آس پاس کے ماحول کے واسطے سے کیا۔ انسان پر اس کی اپنی ذات اور ماحول کچھ ایسا حاوی ہے کہ آج بھی اس نے اپنی زمین سے باہر کی دنیاؤں میں اپنی ہی زندگی کے لوازم کو سامنے رکھ کر وہاں بھی عناصرِ اربعہ کو ڈھونڈا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تحقیق کے مطابق وہ خود بھی جن نامیاتی اجزا سے عبارت ہے اور جن عناصر کے بغیر اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں، اس نے انہی اجزا کی موجودگی کو چاند اور مریخ وغیرہ پہ تلاش کرنے کی سعی کی۔ یعنی اگر یہ عناصر وہاں موجود ہیں تو وہاں پر بھی زندگی موجود ہوگی ورنہ نہیں۔ انسان کی مجبوری یہ ہے کہ جس چیز کو اس نے اپنے حواسِ خمسہ سے نہیں جانا اس چیز کا ادراک کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال عہدِ قدیم کے انسان کی بھی تھی کہ جس نے کائنات کی تخلیق کو بھی انسانی تولیدی عمل کے مشابہ قرار دیا اور پھر اس تصور کی تجسیم کی خاطر متعلقہ دیوتاؤں کے تولیدی اعضاء بنائے اور پھر دیوتاؤں کے بنائے ان اعضاء کو متبرک جان کر ان سے حصولِ مقصد کی توقع رکھی۔ اس عمل کو عبادت کا نام دیا جو کہ کچھ ہندو فرقوں میں آج بھی مروّج ہے۔

اب اگر ہم الہامی مذاہب کی طرف آئیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بُت پرستی کو ختم کرنے کے لیے جب

قوم کی طرف بھی اپنا رسول بھیجا اُسے اس قوم کے رجحانات کے مطابق معجزات عطا کیے تاکہ ان لوگوں کے ذہن مسخر ہو سکیں۔ مزید برآں اس نے اپنے بتلائے ہوئے رستوں پہ چلنے والے نیک بندوں کے لیے جن انعامات کا وعدہ کیا ان کی نوعیت بھی وہی بتلائی جو اس قوم یا علاقہ کے لوگوں کے لیے باعثِ کشش تھیں۔ اسی طرح بدکاروں کے لیے اذیت دینے والی جن چیزوں کا ذکر کیا ان سے بھی وہ لوگ بخوبی آگاہ تھے۔ دیومالائی قصوں میں بھی جزا و سزا کی کچھ ایسی ہی صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ الغرض دیوتاؤں سے انسانوں کے منسوب کردہ اوصاف ہوں یا پھر خود خدائے واحد کی جانب سے اس کے اپنے اوصاف کی خبر، دونوں کے موازنے سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ نہ تو انسان نے اپنے دیوتاؤں کی جانب کوئی ایسی طاقت اور قدرت منسوب کی کہ جس سے وہ خود واقف نہ تھا اور نہ ہی خدائے واحد نے عمومی طور پہ اپنی کسی ایسی قدرت کا ذکر کیا کہ جس سے انسان بے بہرا تھا۔ موخر الذکر صورت میں خدا نے انسان کو انسان ہی کی زبان میں پیغام دیا تاکہ وہ اس کے مقصود کو اپنے اور اپنے معقول کے حوالے سے سمجھے اور اس طرح اس کے پیغام پر عمل پیرا ہو سکنے میں کوئی عذر پیش نہ کر سکے۔

بت پرستوں کو علم تھا کہ ان کے معبود کیا ہیں لیکن انھوں نے بتوں کو بنا کر خود ان کی محتاجی قبول کی تھی لیکن خدا نے الہامی کتابوں کے ذریعے اپنا تعارف خود کروایا کہ وہ ذات و صفات کے لحاظ سے کیا ہے اور اس طرح انسان پر واضح کیا کہ کائنات میں موجود ہر شے اس کی محتاج ہے۔

یہاں سے یہ اخذ کرنا کہ خدا بعینہٖ وہی کچھ ہے کہ جس کا ذکر خود اس نے کر دیا ہے اس لیے درست نہ ہو گا کہ وہ ذات و صفات کے حوالے سے انسانی تخیل میں آ تو سکتا ہے لیکن انسان اس کی لامحدود ذات و صفات کو اپنے تصور میں لانا بھی چاہے تو لامحدود کو اپنے محدود تصور میں نہیں لا سکتا۔ انسان کو اس کے خود ساختہ دیوتاؤں سے اور کچھ ملا یا نہ ملا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اسے اپنے دیوتاؤں کی صفات سے بہت حد تک مشترک صفات کے حامل خدائے برتر کو پہچاننے میں آسانی ہوئی اور اس طرح ایک ہی ہستی میں تمام اوصاف کا جمع ہونا پا کر اس کے حق میں بہتوں نے اپنے بے شمار دیوتاؤں کی عبادت سے چھٹکارا پا لیا۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں انسان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے متعارف کرایا وہاں اسے غور و تدبر کی دعوت بھی دی اور اس طرح اسے کائنات اور مظاہرِ قدرت کی طرف متوجہ کیا۔ اس دعوتِ غور و فکر کے نتیجے میں انسان کی نظر قرآنِ کریم میں موجود "ربّ العٰلمین" کے الفاظ پہ بھی پڑی۔ عالمین کا مطلب چونکہ ایک سے زیادہ عالم ہیں لہٰذا کچھ مفسرین کے نزدیک زمین کی طرح دیگر عالم بھی ہیں جہاں زمینی مخلوق جیسی کوئی مخلوق آباد ہے۔ کچھ کے نزدیک عالمین سے مراد انسان، جنات اور فرشتوں کے الگ الگ عالم ہیں۔ کچھ مفسرین کے مطابق اس سے مراد اجرامِ فلکی، جمادات، نباتات اور زمین پر بسنے والے انسان، چرند، پرند، آبی جانور، کیڑے مکوڑے اور خورد بینی

مخلوق ہے کہ جن میں سے ہر ایک کا اپنا عالم ہے۔ ہر مفسر نے لفظ "عالمین" کی تشریح اپنی آگہی کے مطابق کی ہے۔ اس کی اصل حقیقت تو اس ذاتِ واحد کو معلوم ہے جو اپنے آپ کو ایک سے زیادہ عالموں کا رب کہتا ہے۔

اسی طرح کائنات کے وجود میں آنے کے سلسلے میں لفظ "کُن" کی ادائیگی کے وقت خدا کا مخاطب کون سی ذات تھی یا اس کی صفات یا کچھ اور، اس کا علم بھی خدا سے برتر کو ہے۔ ہمیں قرآنِ کریم کے ذریعے اس قدر معلوم ہے کہ لفظ "کُن" کی ادائیگی کے نتیجہ میں یہ کائنات بتدریج وجود میں آئی جو ایک سے زیادہ عالموں کا مجموعہ ہے۔ چونکہ ادراک میں آنے والی چیزیں عالمِ محسوسات سے ماخوذ ہوتی ہیں لہٰذا انسان کسی ایسی چیز کا تصور ہی نہیں کر سکتا کہ جس سے وہ واقف نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم زمین سے باہر کسی ایسے عالم کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ جس میں رہنے والے نہ تو حواسِ خمسہ کے محتاج ہوں اور نہ ہی اپنے وجود کے لیے معروف عناصرِ اربعہ کے۔ ایسی ہی بات ہم خدا کی بابت بھی کہہ سکتے ہیں، یعنی ہم نے اسے اسی کے بتلائے ہوئے اسماءِ مبارکہ کو اپنے ادراک کے اندر ہی اندر رہ کر سمجھا کہ وہ کیا ہے۔ نامعلوم وہ اصلاً ان تصورات سے بھی ماورا ہوگا اور اس نے اپنے بیان کردہ اسماء کو انسان کی سمجھ میں آ جانے والے الفاظ کی صورت میں سمو دیا ہو۔

مشاہدہ کے لیے ہماری ہر ایجاد یا تو براہِ راست یا پھر بالواسطہ طور پر ہمارے حواسِ خمسہ کی محتاج ہے اور انہی کی بنا پر ہم کسی چیز کی موجودگی یا غیر موجودگی کا پتہ چلاتے ہیں۔ فرشتے اور جنات ہم نہیں دیکھ سکتے لیکن ان کے وجود کو مذہبی عقیدے کے تحت پوری شدت سے تسلیم کرتے ہیں۔ ہم میں سے بہت سوں کو یہ مخلوق عالمِ وجدان میں نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ روحانی عمل کے تحت کوئی سے دو اشخاص کے مشاہدے ایک جیسے نہیں ہوتے تاوقتیکہ ان کی بنیاد کسی Universal truth پر نہ ہو۔ خدا کا ایک ہونا گو سب کے لیے ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے لیکن وہ کیسا ہے، اس کا تعلق ہر شخص کے اپنے علم اور اس کے تحت اس کے تصورِ خدا سے ہے۔ سائنسی تجربہ گاہ میں کیے جانے والے تجربات کسی دوسرے شخص کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ایسا کرنے سے کم و بیش وہی نتائج ملیں گے جو دوسروں کے ہاتھوں پہلے سے برآمد ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ہر سائنسدان تجربات دہرانے کی بجائے ان کے نتائج کو بنیاد بنا کر آگے چل سکتا ہے لیکن کسی ایک کے روحانی تجربات کسی بھی دوسرے شخص کو منتقل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے ہر شخص کو تمام منازل خود طے کرنا ہوں گی۔ معمولی سطح پر البتہ یہ ممکن ہے کہ بیرونی ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کسی کے شعور میں سما جائیں اور وہ مقتدی کی طرح اور کچھ دیکھ ہی نہ سکے۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ہر چیز کو آفاقی پیمانوں سے دیکھتا اور سمجھتا جاتا ہے تاکہ اس کے تجربات کے نتائج دوسروں کے لیے نقطۂ آغاز کا کام دے سکیں۔ اسی لیے ہم نے مذہبی عقائد کو بھی مادی دنیا کے پیمانوں سے

ناپنے کی اور جانچنے کی کوشش کی۔ اسی طرح جہاں کچھ لوگ مذہب کی صداقت کے منکر ہوئے وہاں بہت سے لوگ اس کی صداقت پر ایمان بھی لائے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف اپنی صفات کے حوالہ سے کرایا۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے اس کے وہ پہلو جو اس کی صفات سے عیاں نہیں ہیں ان میں سے ایک چیز خود اس کی اپنی شکل و شباہت ہے۔ اسے جاننے کے لیے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خدا کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تو خدا نے اپنے آپ کو ایک تجلی کی صورت میں ظاہر کیا۔ قرآن کریم میں خدا نے اپنی ذات کو ایک روشن چراغ سے متعلق ایک مثال دے کر واضح کیا لیکن مثال اور حقیقت کے درمیان جو فرق ہوا کرتا ہے وہ اپنی جگہ بدستور قائم رہا۔ جب موسیٰ علیہ السلام خدا کو دیکھ کر بھی نہ دیکھ سکے تو مثال کے ذریعے حقیقت کیونکر واضح ہو سکتی ہے۔ بہرحال مثال اور حقیقت کے درمیان موجود فرق کو کم کرنے کے لیے صوفیوں اور عارفوں نے اپنی تمام تر ریاضتوں کے باوجود جو پایا وہ یہ ہے کہ یہ نیک بندے خدا کے مقرر کردہ مقام عبودیت کے قریب تر ہوئے اور اسے خدا کی حقیقت کو پا لینے کا نام دیا۔ اس سب کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ بدستور رہا کہ خدا کی ہستی کیسی ہے اور ہر جگہ اور ہر وقت کیسے موجود ہے؟ جب خدا ہر جگہ ہے تو پھر اس کا کسی ایک جگہ پر متمکن بھی ہونا کیسے ممکن ہے؟ خدا کے حوالے سے یہ سوالات بھی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کہ:

وہ کونسی جگہ ہے کہ جہاں پر جنت بھی ہے اور جہنم بھی؟

اسی طرح کائنات کی لامحدود وسعتیں آخر کیا معنی رکھتی ہیں؟

حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں انسانی روپ میں آنے والے فرشتے کہاں سے آئے تھے اور پھر کہاں چلے گئے؟

حضرت سلیمان علیہ السلام کے جنات ملکہ سبا کا تخت ایک طویل مسافت پر واقع علاقے سے پلک جھپکتے میں کیسے لے آئے اور ان کے دیگر کام کاج بعجلت تمام کیسے کر دیا کرتے تھے؟

عقیدے کی حد تک ان میں ایک بھی سوال ایسا نہیں کہ جسے عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی گنجائش ہو لیکن یہ سب کیسے ممکن ہوا، اسے جاننے کے لیے عقل کو معطل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ غور و فکر کا تعلق عقیدے سے نہیں عقل سے ہے۔ بعض عقیدے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا عقلی سائنس سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کبھی عقلی سائنس کی گرفت میں آ سکیں گے مثلاً موت کے بعد دوبارہ حیات کا تصور، یوم حساب و کتاب اور عذاب قبر وغیرہ۔ البتہ کچھ عقیدوں کو ایک حد تک معلوم سائنس کے حوالے سے قدرے تفصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کی بنیاد خود اللہ تعالیٰ نے فراہم کر دی ہے کہ جس نے کائنات کو ایک مکمل نظام کے تابع بنا کر اسے انسان کی توجہ کا مرکز

بنایا۔ اجرامِ فلکی جس طرح کائنات کی وسعتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں وہ خدا کی قدرتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انسانی مشاہدہ کی بنا پر جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حرکت ہی پر کائنات کا کل نظام مبنی ہے اور اسی کے تحت ستاروں اور سیاروں کی گولائیاں حتیٰ کہ قوتِ تجاذب کا وجود ہے جو تمام کائنات کو باہم طور پر قائم رکھے ہوئے ہے۔ کائنات کے مشاہدہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین اپنے محور کے گرد بھی گھومتی ہے اور سورج کے گرداگرد ایک بیضوی مدار میں بھی۔ نظامِ شمسی کے دیگر ممبر بھی سورج کے گرد اسی طرح حرکت پذیر ہیں۔ پورا نظامِ شمسی اپنے سے ایک بڑے گردشی نظام کا ممبر ہے۔ وہ بڑا نظام آگے چل کر اپنے سے بڑے نظام کا ممبر ہے۔ الغرض پوری کائنات ہی محوِ گردش ہے۔

مشاہدہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کائنات کے ہر جزو یا پھر جزوی کُل کی حرکت محوری ہو یا مداروی، اس کے ہر اگلے چکر کا رستہ پچھلے چکر کے راستہ سے قدرے ہٹ کر ہوگا۔ اس لحاظ سے پوری کائنات کا نظامِ حرکت دائری نہیں بلکہ مرغولوی ہے اور اس لحاظ سے ہر دم متغیر بھی۔ ایٹم کی اندرونی ساخت کے بارہ میں بہت سے نظریات پیش کیے گئے تھے لیکن جیسے ہی اس ساخت کو خدا کے بنائے ہوئے نظامِ شمسی کی بنیاد پر دیکھا گیا تو اس سے نہ صرف یہ کہ بے شمار مشاہدات کی تصدیق ہوئی بلکہ اندازِ حرکت میں مشابہت کی بنا پر اس کائنات کے رموز بھی آشکار ہونے شروع ہو گئے۔ تحقیق سے جب یہ پتہ چلا کہ ایٹم میں موجود الیکٹرون اور اسی طرح دیگر ذرات جب اندرونی یا بیرونی قوتوں کے تحت رواں ہوتے ہیں تو وہ اپنے اپنے راستوں پر ڈولتے ہوئے چلتے ہیں یعنی ان کی حرکت کا انداز موجوں کا سا ہوتا ہے۔ یہاں سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا وہ یہ تھا کہ ہر حرکت اپنی نوعیت کے لحاظ سے موجی ہوتی ہے اور خطِ حرکت خمدار۔ دوسرے لفظوں میں کائنات کے اندر ہر سیدھی سے سیدھی لکیر خمدار ہوتی ہے اور بڑھاتے بڑھاتے بالآخر اپنے نقطۂ آغاز سے جا ملے گی۔ اس بنیاد پر جو ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات گردی ہے لہٰذا محدود بھی ہے۔ مگر اس محدود کائنات میں سمانے والا مادہ لامحدود بھی ہو سکتا ہے۔ ایٹم ہی کے مطالعہ سے یہ پتہ چلا کہ اس کے اندر کے ذرے جن قوتوں کے زیرِ اثر ایک دوسرے سے مربوط ہیں وہ قوتیں کششِ ثقل یا پھر مقناطیسی قوتوں سے مختلف ہیں۔ نیز ایٹم بہت سے عوامل کے تحت نئے قسم کے ذروں کو بھی جنم دیتا ہے اور اس عمل میں جہاں توانائی خرچ ہوتی ہے وہاں خارج بھی ہوتی ہے۔ خرچ یا خارج ہونے والی توانائی مقدار کے لحاظ سے مادہ میں بقدر زیادتی یا کمی کے عین مطابق ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مادہ اور توانائی ایک ہی چیز کے دو مختلف روپ ہیں اور بوقتِ ضرورت ایک دوسرے میں بدل سکتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں۔ یہی دو پوری کائنات پہ چھائے ہوئے ہیں اور مظاہرِ قدرت کا باعث ہیں۔

مندرجہ بالا میں سے بہت سے نتائج آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت سے ماخوذ ہیں۔ اس نظریہ کے تحت

حاصل ہونے والے نتائج اس قدر انقلابی ہیں کہ ان کی رُو سے مادہ، فاصلے اور وقت کی روایتی تعریفیں بھی متاثر ہوئی ہیں۔

اس نظریہ کی رُو سے خلا میں کسی جسم کے مقام کا تعین کرنے کے لیے روایتی سہ ابعادی محدد کے ساتھ ساتھ وقت کو بطور چوتھی بُعد کے شامل کرنا از بس ضروری تصور ہوا۔ بعد ازاں ابعاد کی تعداد چار سے بھی زیادہ متصور ہوئی۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے نیوٹن کی میکانیات کو بہت حد تک کلاں سطح تک محدود کر دیا ہے جبکہ آئن سٹائن کی میکانیات خورد و کلاں ہر سطح پر درست ثابت ہو رہی ہیں۔

آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت میں روشنی کی رفتار کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اس بنیادی حیثیت کے تحت جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ کچھ ایسے ہیں کہ ان کی مدد سے کچھ مذہبی عقاید کے حل ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اسی کوشش میں یہ ضروری ہے کہ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی رُو سے مادہ، فاصلے اور وقت کی جو نئی جہتیں سامنے آئی ہیں، پہلے ان کو مختصراً بیان کر دیا جائے یعنی وہ کیا ہیں؟ اور روشنی کی رفتار کے ذریہ اثر ان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ چونکہ روشنی کی رفتار ان امور میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے اس لیے اوّلاً اسی کی بابت کچھ کہنا مناسب ہوگا۔ یہ مضمون اپنی نوعیت کے لحاظ سے چونکہ Quantitative نہیں ہے اس لیے فارمولے وغیرہ دینے سے گریز کیا گیا ہے۔

روشنی

روشنی توانائی کی ایک قسم ہے۔ یہ اپنی ترسیل کے لیے کسی واسطہ کی محتاج نہیں۔ اپنے منبع سے براہِ راست خلا میں سے ہوتی ہوئی کرۂ ارض تک پہنچتی ہے۔ خلا میں روشنی کی رفتار ہی اس کی اصل رفتار ہے جو کہ تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ یا پھر تقریباً ۶۷ کروڑ میل فی گھنٹہ ہے۔ ہوا، پانی اور شیشے وغیرہ سے روشنی کی رفتار واسطہ کی نوری کثافت کے بحاظ کم ہو جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی شے روشنی کی خلا میں رفتار کو نہیں پہنچ سکتی۔ البتہ کائناتی عوامل کے ذریعے چھوٹے چھوٹے ایسے ذرّے ضرور وجود میں آ جاتے ہیں کہ جن کی رفتار واسطوں میں روشنی کی رفتار سے زیادہ ہوتی ہے یا پھر تجربہ گاہ میں کچھ ذرّوں کی رفتار اسی سطح پر لائی جا سکتی ہے لیکن یہ رفتار کسی طور خلا میں نوری رفتار کے برابر نہیں ہو سکتی۔ روشنی کی رفتار کی ایک خاص صفت یہ بھی ہے کہ چاہے روشنی کا منبع حرکت میں ہو یا نہ ہو، اسی طرح ناظر بھی خواہ حرکت میں ہو یا نہ ہو ہر صورت میں رفتارِ نور کی پیمائش یکساں ملے گی۔ روشنی کی رفتار کی یہی صفت نظریۂ اضافیت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ روشنی اگرچہ ایک محدود رفتار سے چلتی ہے مگر روشنی کی دنیا میں رہنے والے کے لیے اور روشنی کی

دنیا سے باہر رہنے والے کے لیے فاصلے اور وقت کی مقداریں اپنے اپنے معنی رکھتی ہیں۔

مادہ

نیوٹن کی میکانیات کی رو سے مادہ کی کمیت جمودی ہے لیکن آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیت کی رُو سے کسی جسم میں مادہ کی مقدار یعنی کمیت اس جسم کی رفتار کے ساتھ منسلک ہے۔ اگر جسم کی رفتار کو بڑھایا جائے تو اس کی کمیت میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا حتیٰ کہ اگر جسم کی رفتار روشنی کی خلاء میں رفتار کے برابر ہو جائے تو کمیت لامتناہی ہو جائے گی۔ آئن شٹائن ہی کے نظریہ کے مطابق چونکہ مادہ اور توانائی ایک دوسرے میں بدل سکتے ہیں اس لیے وہ توانائی جو کسی جسم کی رفتار بڑھانے پر خرچ ہوتی ہے وہ کمیت کی صورت میں بدل کر متحرک جسم کی کمیت میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ چونکہ کسی جسم کی رفتار کو رفتارِ نور کے برابر لانے کیلیے توانائی بھی لامتناہی درکار ہوگی جو کہ ایک ناممکن امر ہے اس لیے کسی بھی جسم کی رفتار روشنی کی رفتار کو نہیں پہنچ سکتی۔ رفتار میں اضافے کے ساتھ کمیت میں اضافے کا ثبوت خورد بینی کمیت کے ذرات پر تجربات اور مشاہدات کے ذریعے حاصل کیا جا چکا ہے۔ کلاں سطح پر بھی اضافہ ہوتا ہے مگر چونکہ نگاہ کی گرفت میں آنے والے اجسام کی رفتار روشنی کی قریباً ۶۷ کروڑ میل فی گھنٹہ کی رفتار کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی لیے ان کی کمیت میں ہونے والے اضافے کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

فاصلہ

لامتناہی حد تک قریب واقع نقطوں کے تسلسل کو فاصلہ کہتے ہیں۔ عام فہم زبان میں دو نقطوں کے درمیانی طوالت کو فاصلہ کہتے ہیں۔ اگر فاصلہ طے نہ کیا جائے تو از خود طے نہیں ہوتا۔ جب کوئی فاصلہ طے کرنا چاہے تو اپنے جائے مقام سے کسی بھی سمت میں جا سکتا ہے اور پلٹ کر واپس بھی آ سکتا ہے۔ کسی مقام سے ایک طرف کے فاصلے کو مثبت اور اس کی برعکس سمت کو منفی مانا جاتا ہے۔ آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیت کی رو سے اگر کوئی جسم یکساں مگر بے حد تیز رفتاری سے حرکت کرے تو حرکت کی سمت میں واقع اس جسم کی لمبائی سکڑ جائے گی جبکہ اس کی بقیہ دو عمودی لمبائیاں بدستور رہی رہیں گی۔ اسی نظریہ کی رو سے اگر متحرک جسم پر موجود ناظر پلٹ کر دیکھے تو اسے پیچھے چھوڑے ہوئے ناظر کے اجسام کی لمبائیاں سکڑی ہوئی نظر آئیں گی۔ جبکہ اس کے مقابلے میں ہر دو ناظرین کو اپنی اپنی لمبائیاں بدستور پہلے جیسی نظر آئیں گی اور وہ اس لیے کہ اگر متحرک ناظر کے فاصلے سکڑتے ہیں تو اس کے پیمائشی آلے بھی بقدر نسبت سے سکڑ جائیں گے۔ اگر متحرک جسم کی یکساں رفتار نظریاتی طور پر روشنی کی

رفتار کے برابر ہو جائے تو پھر دونوں ناظرین کو ایک دوسرے کی مذکورہ بالا سفید گھڑیاں صفر کے برابر نظر آئیں گی۔

وقت

لمحوں کے لامتناہی تسلسل کو وقت کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے وقت ایک لمحے سے دوسرے لمحے کی جانب Jump کرتا ہے۔ اگرچہ یہ چیز سائنسی طور پر بے حد اہم ہے لیکن موجودہ مضمون کی نوعیت کے پیش نظر اسے نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ کہیں گے کہ دو واقعات کے درمیانی عرصہ کا نام وقت ہے۔ وقت اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسی چیز ہے کہ اگر کوئی نہ بھی گزارنا چاہے تو بھی وقت ایک مکمل تسلسل کے ساتھ ایک ہی سمت میں گزرتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فاصلے کے برعکس وقت پر انسان کو کسی قسم کا کوئی کنٹرول حاصل نہیں۔ اس لحاظ سے انسان گزرے ہوئے وقت میں کسی طور داخل نہیں ہو سکتا۔ ماضی اور مستقبل کے الفاظ کا تعلق وقت کی سمت یا خاصیت کے ساتھ نہیں بلکہ یہ زمانہ حال کی نسبت سے گزرے ہوئے اور آنے والے وقت میں تمیز کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ وقت کو بیان کرنے کے لیئے اوّل دن ہمارے سورج کے چڑھنے اور ڈوبنے اور پھر چڑھنے کے دورانیہ کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح وجود میں آنے والے شب و روز کی طوالت کو گھنٹوں، منٹوں اور سیکنڈوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہی دورانیہ میکانکی یا دیگر مرئیہ گھڑیوں پر منتقل کر چکنے کے بعد انسان سورج کے طلوع و غروب کا محتاج نہیں رہا۔ ہمارے سورج کے حوالے سے وقت کا کوئی تصور نہیں ہے اور اب یہ گھڑی ہی دو واقعات کے درمیانی وقفے کی طوالت واضح کرتی ہے۔ یہ وقفہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے طبعی ہو گا اور ایک جیسے حالات کے تحت پیمائش کرنے والے تمام لوگوں کے لیے یکساں طوالت کا حامل ہو گا۔ وقت کا بہاؤ چونکہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں رہتا ہے اس لیے اسے مثبت مانا گیا ہے۔ وقت کے بہاؤ کا ایک ہی سمت ہونا صرف اسی صورت میں ممکن خیال کیا گیا ہے جب ہم یہ تصور کریں کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس طرح ایک محدود میں حرکت پذیر چیز واپس اپنی جگہ پر لوٹ کر اپنا چکر دوبارہ شروع کرتی ہے یا پھر جیسے ایک پنڈولم اپنی انتہائی حدود کو پہنچ کر واپس پلٹتا ہے۔ اسی طرح کائنات میں بھی ایک RYTHEM ہے اور وہ بھی جب اپنی آخری حد کو پہنچ کر واپس پلٹے گی اور سکڑنا شروع کر دے گی تو منفی وقت کا تصور بھی وجود میں آ جائے گا۔ ایسا ہونے پر جب منور جسم کی رفتار روشنی کی رفتار کے برابر یا زیادہ ہو جائے گی تو پھر منور جسم کی حرکت کی سمت میں اندھیرا ہو گا اور روشنی کی موجیں پیچھے رہ جائیں گی۔ موجودہ صورت کے تحت روشنی کی موجیں مبداء نور کے چاروں

اطراف ہوتی ہیں۔

آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی رو سے وقت بھی اجسام کی رفتار سے منسلک ہے۔ اگر ایک جسم روشنی کی لگ بھگ رفتار سے خلا میں سفر کرنا شروع کر دے تو زمین پر موجود ساکن ناظر کو متحرک جسم پر موجود ناظر کی گھڑی مقابلتاً سست نظر آئے گی یعنی زمینی ناظر کو اگر اپنی گھڑی پر گزرا ایک گھنٹہ نظر آیا ہے تو اسے متحرک ناظر کی گھڑی پر ایک گھنٹہ سے کم وقت گزرا نظر آئے گا۔ بجنسہٖ متحرک ناظر کو زمینی ناظر کی گھڑی سست نظر آئے گی۔ اگر متحرک ناظر کی رفتار روشنی کی رفتار کو پہنچ جائے تو پھر زمینی ناظر کو متحرک ناظر کی گھڑی رکی ہوئی محسوس ہوگی اور یہی طرح متحرک ناظر کو زمینی ناظر کی گھڑی رکی ہوئی نظر آئے گی۔ اصل میں جو گھڑی رکے گی وہ متحرک ناظر کی ہوگی کیونکہ وہ ہی رفتار نور سے سفر کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں متحرک شخص timeless دنیا میں سفر کرے گا اور وہ ذہنی طور پر بھی timeless دنیا کا باشندہ ہوگا۔ اس حالت میں اس کی جسمانی شکست و ریخت بھی ختم ہو جائے گی اور وہ اپنی عمر اور شباہت کے لحاظ سے منجمد ہو جائے گا۔ تیز رفتاری سے سفر کرنے والا خلائی مسافر جب زمین پر واپس پہنچے گا تو اسے اپنی غیر حاضری کا دورانیہ اپنی گھڑی کے لحاظ سے کم اور زمینی ناظر کی گھڑی کے لحاظ سے زیادہ معلوم ہوگا۔ یہ فرق صرف اسی صورت میں نمایاں نظر آئے گا جب خلائی مسافر روشنی کی رفتار کے لگ بھگ رفتار سے سفر کرے گا۔ خیال ہے کہ یہ فرق یا تو اس دوران پڑتے ہیں جب کسی جسم کی رفتار اس کی روانگی پر اسراع اور واپسی پر ابطاء کی حالت میں سے گزرتی ہے یا پھر یہ فرق اس دوران واقع ہوتے ہیں جب ایک جسم اپنی واپسی کے لیے دائری چکر لگاتا ہے۔ ایسا کرنے پر اس کی رفتار کی رو اسی سمت میں پیدا ہونے والا اسراع وہی کام کرے گا جو اس جسم پر حالتِ اسراع یا ابطاء کے تحت ہونا تصور کیا گیا ہے۔

روشنی کی سی رفتار کے ساتھ سفر کرنے والا شخص جب واپس زمین پر پہنچے گا تو وہ اپنے آغازِ سفر کے وقت اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے جڑواں بھائی کی نسبت جوان ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں ساکن شخص پر گزرا ہوا وقت زیادہ اور متحرک شخص پر گزرا ہوا وقت کم ہوگا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ گھڑی کے سست پڑنے سے آخر مراد کیا ہے؟

معروف معنوں میں ایک ہی جسم پر موجود دو گھڑیوں میں سے سست گھڑی کے دو وقفوں کا دورانیہ درست گھڑی کے انہی دو وقفوں کے دورانیہ سے لمبا ہوتا ہے یعنی جتنی دیر میں سست گھڑی کے ڈائل پر ایک گھنٹہ گزرتا ہے، اتنی دیر میں درست گھڑی پر زیادہ وقت گزرا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسی صورت میں دو گھڑیوں کے ثانیوں کا وقفہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اگر متحرک جسم کی گھڑی کچھ ایسی ہی سست روی

سے دوچار ہو گئی ہے تو پھر دونوں گھڑیوں کے ثانیے ایک جیسے وقفہ کے برابر نہیں ہوں گے اور دونوں علیحدہ علیحدہ وقت بتلائیں گی۔ نظریہ اضافت کے تحت سست روی سے مراد یہ نہیں ہے کہ متحرک جسم کی گھڑی کے ثانیے کے وقفے کسی نقص سے دوچار ہیں۔ اگر وہ کم وقت بتلا رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساکن جسم کی گھڑی کے مطابق ہونے والا کام متحرک جسم کی گھڑی کی نسبت سے جلد انجام پذیر ہوگا۔ یعنی ساکن جسم پر موجود ایک مرغی اپنے انڈے سے بچے نکال چکی ہوگی جبکہ متحرک جسم پر بیک وقت ویسے ہی عمل میں مصروف ابھی فارغ نہیں ہوئی ہوگی۔ اس لحاظ سے واپسی پر متحرک جسم پر موجود مرغی کے چوزے ساکن جسم پر موجود مرغی کے چوزوں سے عمر میں بقدر چھوٹے ہوں گے۔ یہاں سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ تیز رفتاری کے تحت اجسام کی نشوونما اور شکست و ریخت کا عمل سست ہو جاتا ہے۔ یہ چیز بلحاظ اپنی نوعیت کے ویسی ہی ہے کہ جس طرح تبرید کی عمل کے تحت ہوتا ہے۔ دونوں عملوں میں موجود فرق اس قدر ہے کہ اگر کسی جاندار کو یخ بستہ کر دیا جائے تو ایک لمبے عرصہ کے بعد دوبارہ بتدریج گرم ہونے پر وہ اپنی عمر کا سفر وہیں سے شروع کرے گا کہ جہاں عمل تبرید کے ذریعے ختم کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایک نہایت ہی تیز رفتار جاندار پہ عمل اس کی تیز رفتاری کے باعث بے پناہ سست ہو جائے گا۔ یہی چیز کچھ جانداروں یا پھر ان کے اعضاء پہ تجربہ گاہ میں آزمائی جا چکی ہے اور وہ وقت کی گزران کے اثر سے بہت حد تک محفوظ پائے گئے ہیں، جبکہ دوسری صورت کا مطالعہ اس وقت ممکن ہوگا جب روشنی کی سی رفتار سے سفر کر کے کوئی جاندار زمین پر پہنچے گا۔ نظریہ اضافیت کے تحت اگر جسم کی رفتار روشنی کی رفتار سے بڑھ جائے تو پھر وقت ایک [illegible] مقدار بن جائے گا۔ اسے اگر منفی وقت کہا جائے تو پھر مو سفر شخص اپنی روانگی کے وقت سے قبل واپس پہنچے گا، یعنی وہ دوبارہ ماضی میں داخل ہو جائے گا۔

ریاضی کے فارمولوں کے واسطے سے وقت کی اضافیت کے نتائج کا مشاہدہ انسان خود اپنی ذات کے حوالے سے اس لیے نہیں کر سکتا کہ روشنی کی رفتار کے قریب تر رفتار سے سفر کرنا اس کے لیے سردست ممکن نہیں۔ البتہ کائنات میں کچھ ایسے مظاہر پیش آتے رہتے ہیں کہ جن کی وجہ سے ان کی تصدیق ہو چکی ہے۔ کائنات سے آنے والی شعاعیں جب ہوا میں داخل ہوتی ہیں تو خورد بینی ذروں کی ایک قسم یعنی "میو میزون" کو جنم دیتی ہیں۔ یہ میزون اپنی گھڑی کی مناسبت سے دو مائیکرو سیکنڈ زندہ رہ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ تجربہ گاہ میں میو میزون کے جنم سے ختم ہونے تک کا فاصلہ تقریباً ۹۵۰۰ میٹر اور اس دوران اس کی رفتار روشنی کی رفتار کا ۰.۹۹۸ پائی گئی ہے۔ اگر نظریہ اضافیت کے فارمولے کی مدد سے میزون کی زندگی کو بیرونی ناظر کی گھڑی پہ ڈھالا جائے تو جواب ۷.۳۱ مائیکرو سیکنڈ آتا ہے جو کہ بیرونی ناظر کے مشاہدہ میں آنے والے فاصلے اور

اس کی رفتار کے لحاظ سے بالکل ٹھیک بنتا ہے۔ اسی طرح اگر بیرونی ناظر کے ناپے ہوئے فاصلہ کو میسو میزون کے حوالے کے فریم میں ڈھالا جائے تو وہ تقریباً ۰۰ میٹر بنتا ہے جو کہ مذکورہ رفتار اور میزون کے حوالے کے فریم کی مناسبت سے اس کی زندگی کے دورانیہ کے عین مطابق ہے۔ اس بات کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ فرض کریں کہ کوئی جسم ایک ملی میٹر لمبا ہے۔ اگر وہ جسم اور پیمائشی آلہ دونوں ایک خوردبین کی مدد سے دیکھیں تو دونوں چیزیں بالقدر بڑی کی نظر آئیں گی مگر پیمائش وہی ایک ملی میٹر ہوگی۔ اگر جسم کو تو خوردبین کی مدد سے دیکھیں اور اس کی لمبائی خوردبین کے باہر سے کسی طور ناپیں تو وہ جسم پیمائش کے لحاظ سے بہت بڑا ہو جائے گا۔ مطلب یہ کہ اگر ایک دنیا کے اجسام کی پیمائش کسی دوسری دنیا میں رہ کر وہاں کے آلوں سے کی جائے تو جواب اور ہوگا اور اگر پیمائشی آلے بھی جسم کی دنیا میں پہنچا دیئے جائیں تو پھر جواب اور ہوگا۔ اگر حوالوں کی نسبت معلوم کرلی جائے تو ایک دنیا کی پیمائشوں کو دوسری دنیا کی پیمائشوں کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

عام سطح پر نظریہ اضافیت کی وضاحت کے لیے ایک معروف مشاہدہ بیان کرنا ضروری ہے۔ ایک ساکن شخص کو اگر آسمان سے بارش عمودی طور پہ برستی ہوئی نظر آرہی ہے تو اس سے بچنے کے لیے وہ اپنا چھاتہ عمودی انداز سے تان لے گا۔ اگر کوئی دوسرا شخص اسی بارش میں تیز تیز چلا جارہا ہے تو وہ بارش سے بچنے کے لیے اپنا چھاتہ عمودی نہیں بلکہ ترچھا تانے گا اور چھاتے کا زاویہ محوِ حرکت شخص کی رفتار اور بارش کی رفتار کے ماحصل سمت میں ہوگا۔ محوِ حرکت شخص اپنے طور پر حیران ہوگا کہ بارش ترچھی برس رہی ہے، مگر ساکن شخص نے اپنا چھاتہ عمودی تانا ہوا ہے۔ اسی طرح ساکن شخص اپنے طور پہ حیران ہوگا کہ عمودی بارش میں محوِ حرکت شخص اپنے چھاتے کو ایک زاویہ پہ تان کر چلا جارہا ہے۔ اصل میں دونوں اشخاص اپنی اپنی حرکت کی بنا پہ درست ہیں اور اس کی تصدیق صرف اسی وقت ممکن ہے جب ساکن شخص حرکت میں آجائے اور متحرک رک جائے۔ نظریہ اضافیت کی بنا پر بھی اضافی حرکت پہ ہے مگر اس کے نتائج میں رفتارِ نور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

نظریہ اضافیت پر اپنی بحث ختم کرنے سے قبل ایک اور چیز کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ اگر ایک ناظر کی دنیا میں دو واقعات بیک وقت رونما ہو رہے ہوں تو کسی متحرک ناظر کو یہی دو واقعات یکے بعد دیگرے رونما ہوتے نظر آئیں گے۔ برعکس حالت میں بھی یہی صورت ہوگی۔ میزون کے خاتمے کا وقفہ اسی لیے ساکن ناظر کو متحرک ناظر کے مقابلے میں مختلف نظر آئے گا۔ وقت کی یہی وہ صفت ہے کہ جس کے پیش نظر یہ محسوس کیا گیا ہے کہ خلا میں کسی بھی چیز کا مقام متعین کرنے کے لیے روایتی سہ ابعادی COORDINATES کافی نہیں ہیں بلکہ جائے مقام کو متعین کرنے کے لیے وقت کو بطور چوتھی جہت شامل کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس

لحاظ سے Space کا تصور اُس وقت تک صحیح طور پر واضح نہیں ہو گا کہ جب تک اس کے ساتھ وقت کا Co-ordinate منسلک نہ کیا جائے۔ خلا میں وقت کا تصور بہت مشکل امر ہے۔ ایک نظریہ کے تحت تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ خلا میں ایک جیسی کمیت کے جسم اگر ایک جیسی رفتار سے مختلف سمتوں میں سفر کریں تو ایک ہی جتنی دور منزل پر وہ اجسام مختلف وقتوں پر پہنچیں گے۔

وقت کے مندرجہ بالا نتائج اپنی نوعیت کے لحاظ سے طبعی ہیں۔ وقت کا ایک تعلق انسان کی ذہنی کیفیت کے ساتھ بھی ہے۔ اس تعلق کی مندرجہ ذیل مختلف اقسام ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے غیر طبعی ہیں۔

(i) اگر مستقبل کا کوئی لمحہ کسی کے لیے پریشانی کا باعث ہے تو ایسے میں وہ لمحہ دوڑا چلا آتا محسوس ہوتا ہے۔ اگر آنے والا وہی لمحہ خوشی کا باعث ہے تو پھر اُس کی آمد کی رفتار رینگنے کے برابر محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی پر گزرنے والی تکلیف کا خاتمہ اگلے چند لمحات تک ہو جاتا ہے، تو وہ لمحات گزرنے کا نام ہی نہیں لیتے اور اگر وہی لمحے خوشی کے ہیں تو پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ لمحات گزر جاتے ہیں۔ یہاں سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ وقت کے گزرنے کا احساس طلب کے برخلاف ہے۔ یعنی وقت کی طوالت لمحات کی نوعیت پر ہے اور انسانی خواہش سے معکوس طور پر وابستہ ہے۔

(ii) خواب میں گزرنے والا وقت برسوں پر محیط ہو سکتا ہے۔ جبکہ بیرونی پیمائش کے لحاظ سے وہ مدت سونے والے شخص کی کل مدت نیند سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ وقت کا کچھ ایسا ہی تعلق انسانی وجدان سے بھی ہے۔ اپنی وجدانی کیفیت میں ایک طویل عرصہ گزار کر جب کوئی اپنی شعوری حالت میں واپس آتا ہے تو ادھر گزر چکنے والا وقت کم ہوتا ہے۔

(iii) نیند چونکہ عارضی موت کی مانند ہے۔ اس حالت میں گزرے ہوئے وقت کے کم ہونے کا اندازہ قرآن کریم کی اس آیت سے ہو سکتا ہے۔

ترجمہ:

"پھر اللہ تعالٰی نے اس شخص کو سو برس تک مُردہ رکھا پھر اس کو زندہ کر اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ کتنی مدت تو اس حالت میں رہا۔ اس شخص نے کہا کہ ایک دن رہا ہوں گا یا ایک دن سے بھی کم۔ اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تو سو برس رہا ہے۔۔۔۔"

(۷) اگر کوئی اپنے تصور میں کسی چیز کا مشاہدہ کرنا چاہے تو وہ اپنی حالتِ تصور میں اتنا ہی وقت گزارے گا کہ جس قدر اس کی گھڑی آگے کو سرکے گی۔

اشیاء اور وقت کی مندرجہ بالا اقسام کا انسانی ذہن کے ساتھ تعلق کچھ یوں ہے کہ خواب کی حالت میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ غیر ارادی ہوتا ہے مگر چشمِ تصور کے ذریعے انسان وہی کچھ دیکھتا ہے کہ جسے دیکھنے کا اس نے پیشگی ارادہ کر رکھا ہو۔ البتہ روحانی علم کے تحت ان دیکھی اور ان سُنی چیزوں کا اوراک ممکن ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں اس قدر کہنا بے جا نہ ہوگا کہ Cryptaesthesia کے تحت اس قسم کے مشاہدات سائنس والوں کے نزدیک ممکن ہیں۔

ان مثالوں کے ذریعے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عالمِ محسوسات میں رہ کر دو واقعات کے درمیانی عرصہ کی پیمائش کی جا سکتی ہے لیکن خواب، نیند یا وجدانی کیفیت کے تحت گزرے ہوئے دو واقعات کی درمیانی پیمائش گھڑی یا کسی دیگر ذریعہ سے ممکن نہیں ہے۔ اس عرصہ کا دورانیہ اتنا ہی ہوگا کہ جتنا کسی کو ایسی کیفیت میں گزرا ہوا محسوس ہوگا۔ البتہ عمر میں اضافہ اس قدر نہیں بلکہ بیرونی گھڑی پر گزرے ہوئے حساب سے ہوگا۔ چاہے کوئی زندہ مخلوق سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہے یا نہیں عمر کی طوالت کے لحاظ سے اس کی Conditioning ہو چکی ہوتی ہے۔ اگر ہر انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر ستر سال تصور کر لی جائے تو عمر کی اسی حد کو سامنے رکھ کر وہ اپنی بھرپور زندگی گزار کر رخصت ہو جاتا ہے۔ انسان کے نزدیک ایسی خوردبینی مخلوق کی حیثیت کہ جس کی عمر ایک سیکنڈ کے لگ بھگ ہے، اتنی کم ہے کہ اسے سمجھ ہی نہیں آتی کہ وہ ایک سیکنڈ میں کر کیا کر سکتی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خوردبینی مخلوق کا ایک سیکنڈ تک زندہ رہنا اس کے اپنے حوالے سے اتنا ہی طویل ہوتا ہے کہ جس قدر انسان کی اپنی ستر سالہ زندگی۔ وہ مخلوق اسی ایک سیکنڈ میں جنم بھی لیتی ہے، پروان بھی چڑھتی ہے، اپنے نظامِ تخلیق کے تحت اپنی آبادی کو بھی بڑھاتی ہے اور پھر انسانوں کی مانند ایک بھرپور زندگی گزار کر ختم بھی ہو جاتی ہے۔ اپنی Conditioning کے لحاظ سے سینکڑوں سال جینے والوں کا بھی یہی حال ہے۔ اس مثال سے یہ مقصود ہے کہ ہر چیز کا بیان کسی نہ کسی حوالے سے ہوتا ہے۔ انسانی سلوک ہو یا کوئی اور صفت، کوئی لمبائی ہو یا وزن، حسن ہو یا دولت یا طاقت۔ ان سب کے کم و بیش ہونے کا تعلق کسی نہ کسی نسبت سے ہوگا۔ اگر یہ نسبتیں ایسے طبعی آلات سے ناپی جا سکیں جو سب کو یکساں میسر آ سکتے ہوں تو پھر سب کا جواب بھی ایک سا ہوگا اور اگر اس کا تعلق انسانی تجربہ و مشاہدہ سے ہے تو جواب اس لیے یکساں نہیں ہوگا کیونکہ ہر ایک کی جانچ پڑتال کے پیمانے دوسروں سے الگ ہیں۔ مثلاً ہمیں اپنے اردگرد موجود افراد میں بڑی

آسانی سے کم از کم دو ایسے اشخاص مل جائیں گے کہ جن کی شکل یا پھر عادات و فضائل ایک دوسرے سے مشابہ ہوں گے۔ لیکن ان افراد میں ہمیں ایک بھی شخص ایسا نہیں ملے گا کہ جس کی شکل پر ہمیں اپنی شکل کی مماثلت کا گمان ہو تا وقتیکہ ہم نے اپنے آپ کو کسی طور معروضی طور پر نہ دیکھا ہو۔ اپنے آپ کو معروضی طور پر دیکھنے کا کام آئینے سے نہیں لیا جا سکتا کیونکہ ایک تو آئینہ ہماری شبیہ کو اطراف کے لحاظ سے پلٹ دیتا ہے اور دوسرے ہماری ہر حرکت کے ساتھ ہمارا عکس بھی بعینہٖ بیک وقت وہی حرکت کر کے ابھرنے والے تاثر کو CANCEL کر دیتا ہے۔ بصری فلموں کے ذریعے ہم اپنی شکل و صورت اور حرکات و سکنات کو معروضی طور پر دیکھ کر ذہن میں محفوظ کرنے کے بعد دوسروں سے اپنی مشابہت تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہماری سوچ و فکر کا تعلق ہے اس کی مناسبت تلاش کرنے کے لیے یا اُسے جانچنے کے لیے ہمیں خود کو دوسروں کے زاویہ نگاہ سے دیکھنا ہوگا۔

اگر ایسا ممکن ہو سکے تو پھر ہم میں سے ہر شخص واحد دوسروں کے تجربات و مشاہدات، سوچ و فکر اور طرزِ عمل پر مبنی پیمانوں کے لحاظ سے ایک نہیں بلکہ بہت سے اشخاص بن جائے گا۔ فرداً فرداً یہ سب اشخاص اُس شخصِ واحد سے مختلف ہوں گے کہ جو اُس نے اپنے حوالے کے پیمانوں کے لحاظ سے خود کو سمجھ رکھا تھا۔ معاملات چاہے طبعی ہوں یا غیر طبعی دونوں کی نوعیت حوالے کے پیمانے متعین کرتے ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ طبعی صورت میں نتائج Quantitative اور غیر طبعی صورت میں Qualitative ہوں گے۔

سرِ دست نہ تو طبعی سائنس اس سطح تک پہنچی ہے کہ جہاں انسان کی عمر بے پناہ ہو جائے اور نہ ہی ابھی وہ اس قابل ہوا ہے کہ روشنی کی سی رفتار سے سفر کر کے مادہ، فاصلے اور وقت کے ساتھ وابستہ عوامل کا ثبات خود مشاہدہ کر سکے۔ ایسے میں انسان نے کائنات میں رونما ہونے والے عوامل میں سے کچھ کا بالواسطہ مشاہدہ کر کے نظریہ اضافیت کے عین مطابق نتائج پائے ہیں۔ نظریہ اضافیت کی بابت یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اسے کچھ کے بقول Misunderstood کہا گیا ہے۔ ایسا کہنے کا جواز اس کے نام یعنی اضافیت میں ہے۔

مثال کے طور پر اگر دو ساکن گاڑیوں میں سے ایک حرکت میں آ جائے تو پھر ساکن گاڑی میں موجود شخص اپنی گاڑی کو الٹی سمت میں چلتا پائے گا۔ اصلاً وہی گاڑی متحرک ہے کہ جس پر توانائی خرچ ہو رہی ہے۔ جو بھی تبدیلی کسی حرکت کے تحت وجود میں آئے گی وہ بھی اس متحرک گاڑی میں ہوگی۔ ساکن شخص کا ہر احساس مجازی ہوگا اور اس لحاظ سے غیر اہم بھی۔ ایسے میں متحرک جسم کی نسبت سے ساکن جسم میں تبدیلی کو

جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہاں اہم ہوگا کہ جہاں واقعی اس کی ضرورت ہو۔ اضافیت کے لفظ کو معنوی لحاظ سے ہر جگہ استعمال کرنے کا عمل ہی گمراہ کن نتائج کا باعث بنتا ہے۔ نتائج خواہ کچھ بھی برآمد ہوں اُن سے صرفِ نظر کر کے بھی اس نظریہ کو یکطرفہ طور پر دیکھنا چاہیئے یعنی ساکن چیز کی نسبت سے متحرک چیز میں کیا تبدیلی ہوگی۔ کیونکہ اصلاً متحرک چیز پر ہی توانائی خرچ ہو رہی ہے اور ہونے والی ہر تبدیلی اسی ہی کی حالت میں ہوگی۔ ذرات کی رفتار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کی کمیت میں اضافہ یکطرفہ مشاہدہ ہی کے تحت ثابت ہوا ہے۔ متحرک ذروں کی نسبت سے ناظر کی کمیت میں اضافہ فریبِ نظر کے ضمن میں آئے گا۔

نظریہ اضافیت کے تحت وجود میں آنے والی مساواتوں کی صحت کو سرِ دست چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ ان مساواتوں کے نتیجہ میں مادہ اور توانائی کا ایک دوسرے میں باہم تبدیل ہو سکنا اور رفتار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ جسم کی کمیت میں اضافہ ہونا سائنسی تجربہ گاہ میں ثابت ہو چکے ہیں۔ اسی طرح توانائی کے مادی خواص بھی قطعی مشاہدہ میں آچکے ہیں۔ البتہ جہاں تک رفتار اور وقت کی مساوات کا تعلق ہے اس کے مشاہدات انسانی گرفت سے باہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظریہ اضافیت کی اس مساوات کی صحت کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ عزیز احمدؒ نے اپنے ایک مضمون میں ایسے حوالوں کا بکثرت ذکر کیا ہے۔ ان کے مضمون کی بنیاد واقعہ معراج النبیؐ ہے کہ جس کے تحت رسول کریمؐ کی غیر حاضری میں زمین پر گزرا ہوا وقت ہم مسلمانوں کے عقیدہ کی رُو سے اُن کے اس دوران آسمانوں پر گزرے ہوئے وقت کی نسبت بہت ہی کم ہے۔ جبکہ نظریہ اضافیت کی رُو سے نتائج برعکس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظریہ اضافیت کی وقت اور رفتار کی مساوات واقعہ معراج النبیؐ کے ناتے بہت ہی اہم ہے۔ اس نظریہ کی دریافت سے پہلے معراج النبیؐ کو کچھ علماء دین نے جسمانی معراج سے تعبیر کیا اور کچھ نے وقت کی مقداروں کے فرق کے پیشِ نظر اسے روحانی معراج کہا۔ سائنسی نتائج اور واقعہ معراج النبیؐ میں وقت کے اسی تضاد کے پیشِ نظر عزیز احمد نے کہا ہے کہ نظریہ اضافیت چونکہ مسلمانوں کے عقیدہ کے برعکس نتائج دیتا ہے۔ اس لیے یہ نظریہ نوجوان مسلمانوں کو گمراہ کر سکتا ہے۔ اُن کا یہ نتیجہ کافی محلِ نظر ہے۔

مندرجہ بالا ساری بحث بشمول مثالوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نظریہ اضافیت سے بہت کچھ درست ثابت ہو چکا ہے۔ اگر اس سے واقعہ معراج النبیؐ ثابت نہیں ہو سکا تو ایسے میں عقیدہ کی صداقت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ویسے بھی دیگر نوع کے ایسے بے شمار عقائد ہیں جو انسانی عقل سے بالاتر ہیں۔ ان میں سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت کا انداز سرِ فہرست ہے۔ جب اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو بن

والدین اور ماں سے حوا کو پیدا کرسکتا ہے تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت تو محض بن باپ کے تھی اور یہ انداز ولادت معجزہ کے زمرہ میں آتا ہے اور اس پر یقین کرنا عقیدہ ہے۔ معجزات چونکہ پیغمبروں سے نسبت رکھتے ہیں اور زمین پر رونما ہوتے ہیں لہذا ان پر انسانی حیرت اس لیے بجا ہے کہ ان کی کوئی عقلی توجیہہ ذہن میں نہیں آتی نیز کچھ عقائد ایسے ہوتے ہیں جن کی توجیہہ کسی بھی خارجی واسطے سے ممکن نہیں۔ ان میں سے ایک موت کے بعد جیلت ہے۔ یہ امر بھی ایک حد تک قابل ذکر ہے کہ معجزاتِ عقول واقعات کے بھی اسباب و علل ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسباب و علل کا انداز معروف طریقۂ کار سے مختلف ہو اور انسان کو مہیا علم کی بدولت اس کے ادراک میں نہ آسکیں۔ ایسے معجزات میں حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور اس کے بچے کا پہاڑ کی اوٹ سے رونما ہونا یا پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ قربانی کا ایک جانور آجانا بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں معجزے اس لیے اہم ہیں کہ ہر دو قسم کے جانور اپنی نوع کے جانوروں میں کل گنتی کے لحاظ سے اضافہ کا باعث بنے مگر وہ کسی بھی شخص کی ملکیت نہ تھے۔

آخر یہ جانور کہاں سے آگئے ؟

اسی طرح چاند کا کچھ وقت کے لیے دو لخت ہو جانا مگر حرکت کے توازن میں کوئی فرق نہ پڑنا بھی انسانی عقل سے سردست ایسے ہی باہر ہے جس طرح واقعہ معراج النبی ﷺ کی حقیقت۔

برہان احمد فاروقی نے بہت سے مفکرین کا ذکر کیا ہے کہ جنہوں نے مختلف ادوار میں زمان و مکان کی بابت اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے علامہ اقبال کے خیالات کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ انہیں آئن شٹائن کے نظریۂ زمان و مکان سے اختلاف تھا۔ حضرت علامہ کے بقول خدا کا مکان و زمان انسان کے زمان و مکان سے مختلف ہے اور اس میں ماضی اور مستقبل کا کوئی تصور نہیں۔ علامہ اقبال کے اس تصور کے بعد اگر ہم اللہ تعالیٰ کو معروف نور سے ماورا تصور کریں تو اس کی صفات معروف نور کی صفات سے یقیناً مختلف ہوں گی۔ یعنی خدائی نور اپنی رفتار کے لحاظ سے معروف نور سے کہیں زیادہ تیز ہوگا۔ ایسی صورت میں آئن شٹائن کی مساوات کے مطابق وقت ایک مقدار کے طور پر ابھرے گا جس کے تحت وقت کی مقدار ماضی اور مستقبل دونوں سے بے نیاز ہوگی۔

انسانی جسم کے ساتھ دو چیزیں وابستہ ہیں، ایک کو زندگی اور دوسری کو روح کہتے ہیں۔ کسی انسان کی جسمانی موت کے ساتھ اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے مگر اس کی روح کا ختم ہونا متصور نہیں، وہ عالم ارواح کو لوٹ جاتی ہے۔ ہمارے عقیدے کی رو سے روح صرف انسانوں میں ہے، بالفاظ دیگر نباتات اور جانور وغیرہ روح سے عاری ہیں۔ کچھ مذاہب میں ہر زندہ مخلوق کو ذی روح کہا گیا ہے۔ ان مذاہب میں سے کچھ کے

نزدیک موت کے بعد انسان کی روح کا مرنے والے کے اعمال کے مطابق آنے والے دوسرے کسی انسان یا حیوان میں منتقل ہونا تصور کیا گیا ہے۔ ان مذاہب کی رُو سے روح کا بوجوہ بھٹکتے رہنا بھی خیال کیا گیا ہے۔ دوسرے جنم کے تصور کی بنیاد بھی یہی فلسفہ ہے۔ الغرض ہر صورت میں روح لافانی تصور ہوئی ہے۔ نیز روح کو بے پناہ قوت اور صفات کا حامل بھی تصور کیا گیا ہے۔ علم ارواح کے تحت ایک شخص کسی دور مقام پر موجود دوسرے شخص سے کلام کر سکتا ہے، حتیٰ کہ اپنے مخاطب کے ذہن میں گزرنے والے نہ صرف خیالات کو سمجھ سکتا ہے بلکہ اگر چاہے تو اس کے ذہن میں اپنے خیالات منتقل بھی کر سکتا ہے مزید براں وہ کسی زندہ یا مردہ شخص سے بلا تمیز وقت اور فاصلہ رابطہ بھی قائم کر سکتا ہے۔ روحانی قوت کے ان خواص کو کسی سائنسی تجربہ گاہ میں حتمی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکا اور سر دست یہ علم ابھی تک اپنے ابتدائی مراحل میں ایسے ہی ہے جیسے توانائی کی ایک قسم ثابت ہونے سے قبل کبھی روشنی کی بابت دیگر مختلف تصورات قائم کیے گئے تھے۔

چونکہ تشریح عوامل کے لیے کسی نہ کسی نظریہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روح جو کہ انسانوں کو دیگر جانداروں سے جدا کرتی ہے بلکہ اپنے خواص کے لحاظ سے مافوق الفطرت قوت کی ایک نامعلوم قسم بھی ہے، اس کی بھی لہریں ہیں جو بلا لحاظ وقت و فاصلہ ناظر کے ذہن سے منظور کو براہ راست منتقل ہوتی ہیں۔ ناظر اور منظور ہر دو میں ان کی استطاعت کے مطابق ان لہروں کی ترسیل اور انہیں قبول کرنے کی اہلیت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ سب قوتیں نفس پر قابو پانے سے حاصل ہوتی ہیں اور اس کے لیے گیان، دھیان اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کے تحت حاصل شدہ مذکورہ روحانی قوت کو ______

Clairwoyance اور Necro- mancy کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک طرف تو کائنات میں معلوم پانچ قوتوں کو کسی ایک نظریہ میں متحد کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور دوسری طرف ماضی قریب میں کائنات کے اندر ایک نئی خفیف قوت کی موجودگی کا پتہ چلا ہے، اس دریافت سے رموزِ کائنات سمجھنے میں حائل بہت سے الجھاؤ کم ہونے کا امکان ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ جب کہ Para-Psycology پر بھی بہت کام ہو رہا ہے، کوئی ایسی قوت بھی دریافت ہو جائے، جو دیگر قوتوں اور روح جیسی ممکنہ قوت کو ایک رسی میں پرو کر انسان کو زمان و مکان کے رموز سمجھنے میں مدد دے اور اس طرح معراج النبیؐ جیسے مسئلہ کا عقلی حل سامنے آ جائے۔

خدا اور کائنات کو سمجھنے کے لیے ہر دور میں کوششیں ہوئی ہیں۔ مظاہر قدرت کو بنیاد بنا کر آگے چلنے کی تگ و دو میں بسا اوقات قدم پیچھے کو بھی پڑے ہیں لیکن اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ اگر انسان کے قدم پیچھے

کرنا پڑتے تو نہ تو وہ اپنے معبود و دیوتا تخلیق کرتا اور نہ ہی اُن کے توسط سے اُسے خدائے واحد کو پہچاننے میں آسانی ہوتی۔ جب بھی انسان نے حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کی تو اس نے مجاز کو سہارا بنا کر مجاز ہی کی حدوں کو حقیقت کے حق میں ضبط کر دیا۔

قرآن کریم سائنسی علوم پر مبنی کوئی کتاب نہیں کہ جس میں خدا نے کائنات میں ہونے والے مظاہر کے اسباب و علل بھی بالتفصیل بیان کر دیئے ہوں۔ اُس نے تو محض ان کے ذکر پر ہی اکتفا کیا ہے اور باقی سب کچھ انسان کے لیے ان پر تدبّر کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ قرآن کریم میں کائنات کی وسعتوں اور مظاہر قدرت پر بہت کچھ صراحت کے ساتھ درج ہے۔ انسان کے لیے اگر کچھ چھوڑا گیا ہے تو وہ ان عوامل کے اسباب و علل کی تلاش ہے۔ جب تشریح عوامل کے لیے کوئی نظریہ وضع کیا جائے گا تو اس نظریہ کا ارتقائے زندگی تشریح عوامل پر پورا اترنے کا محتاج ہو گا۔ نیوٹن کے نظریات کی صداقت کا چرچا اس وقت تک رہا جب تک کہ آئن شٹائن کے نظریات نے انہیں کسی حد تک چیلنج نہیں کیا۔ کل کلاں کو آئن شٹائن کے نظریات میں بھی ردّو بدل کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نظریہ اضافیت کو کلّی بنیاد دے کر ہم مذہبی عقائد کو حتمی طور پر حل کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے۔ البتہ روشنی کا ہر واسطے سے بے نیاز ہو کر خلا میں سفر کرنا اور اس کی رفتار کا کسی بیرونی حرکت کے تحت متاثر نہ ہونا اپنے قطعی ثبوت کو پہنچ چکے ہیں۔ یہی وہ خواص ہیں کہ جن کی وجہ سے توجہ از خود خدا تعالیٰ کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ کیونکہ اس نے انسان کو سمجھانے کے لیے اپنے آپ کو نور سے مشابہت دی ہے۔ نیز مادہ اور توانائی کے بیک وقت ایک دوسرے کی صفات کا حامل ہونے اور مندرجہ بالا بحث کی بنا پر جو اب تک نتائج اخذ کیے گئے ہیں، ان کی بنا پر جن عقائد کی وضاحت کی جا سکتی ہے، وہ کچھ یوں ہوگی:

۱۔ ہر وہ چیز جو کسی عمل کے تحت وجود میں آئے گی وہ بالآخر فنا بھی ہوگی۔ اس بنا پر پوری کائنات ایک دن ختم ہو کر رہی کچھ بن جائے گی کہ جو "کن" کا لفظ ادا ہوتے وقت خدا کی منشا کے طور پہ اس کی مخاطب تھی۔ چونکہ خدا کی ذات کسی عمل کے تحت وجود میں نہیں آئی اس لیے بقا صرف اسی کی ذات کو ہوگی۔

۲۔ خدا کی لامتناہی یعنی لامتناہی space میں ایک جگہ پر ہے اور اس لحاظ سے وہ پوری کائنات بشمول زمین کے ہر جگہ بھی موجود ہے۔

۳۔ نور کی دنیا میں رہنے والا ایک distanceless اور timeless دنیا کا باشندہ ہے۔ اس کی timeless دنیا کا ایک لمحہ اس مادی دنیا

کے ہزار ہا سال سے بھی کم ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں خدا نے اپنے ایک دن کو اس دنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر کہا ہے۔ خدا نے گو اپنے بندوں کو سمجھانے کے لیے اپنے آپ کو نور سے مناسبت دی ہے لیکن وہ یقیناً نور سے بھی بالاتر ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کی بابت ہمارا ہر تصور محض فرضی ہوگا۔ وقت سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے وہ وقت کی مثبت اور منفی دونوں سمتوں پر حاوی ہے۔

۴۔ خدا کا نور سے بھی بالاتر ہستی ہونے کی وجہ سے اس کے تخلیق کردہ فرشتے اور جنات خدا کی سی قطعی timeless اور distanceless دنیا سے کمتر یعنی روشنی کی دنیا کی مخلوق ہیں اور مرئی روشنی یعنی Cold radiation اور حرارت ہی سے انکا وجود عمل میں آیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ مخلوق اپنی دنیا کے حوالے سے جہاں چاہے اور جب چاہے وہاں آناً فاناً پہنچ سکتی ہے۔ کسی مقام پر ساکن ہو جانے کی وجہ سے یہ مخلوق کسی فوری حکم ربی یا خدا کے عطا کردہ اوصاف کے تحت مادہ کی کوئی سی بھی شکل و صورت اختیار کر سکتی ہے۔

۵۔ اگرچہ انسان معلوم سے نامعلوم کی طرف گامزن ہے۔ لیکن سردست یہ کہا جا سکتا ہے کہ روحانی قوت کی دنیا مادہ اور توانائی کی دنیا سے کہیں اعلیٰ درجہ کی ایک قسم ہے۔ اس کے وجود کو بقدر وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس دنیا کے امور سے پوری طرح آگاہ ہو۔ کل مادہ کے فنا ہونے کے بعد جنت اور جہنم بھی اسی دنیا میں یعنی عالم ارواح میں کہیں ہے کہ جہاں اول آدم کی تخلیق ہوئی تھی۔ تخلیق آدم اسی دنیا کے احاطہ میں آنے والی خلا میں بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ بھی تو خدا ہی کی کائنات کا ایک حصہ ہے۔

۶۔ معراج النبیؐ ایک معجزہ ہے اور اس کی حقیقت اسی طرح ایک سربستہ راز ہے کہ جیسے دیگر معجزات، لہذا اس کے جسمانی ہونے کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تائید میں کل کلاں کوئی سائنسی تشریح بھی آ سکتی ہے۔

آخر میں اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ ان کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ وہ اس کی کن قدرتوں سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، نیز وہ خود اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے کیا ہے۔ انسان کے

علم کی بنیاد اس کی کل حاضر معلومات اور ان سے اخذ کردہ نتائج ہیں، جو غلط ہو سکتے ہیں۔
واللہ اعلم بالصواب!

حواشی

۱۔ القرآن : ۲ : ۲۶۰

۲۔ القرآن : ۲: ۲۵۹

۳۔ Aziz Ahmad 'iqbal Review' April–September P.P 83-170

۴۔ برہان احمد فاروقی: اقبال ریویو، منتخب مقالات ۱۹۸۳ء، ص ۱۲۵: ۱۳۰